THE
BLUE
OF
CAPRICORN
Eugene
Burdick
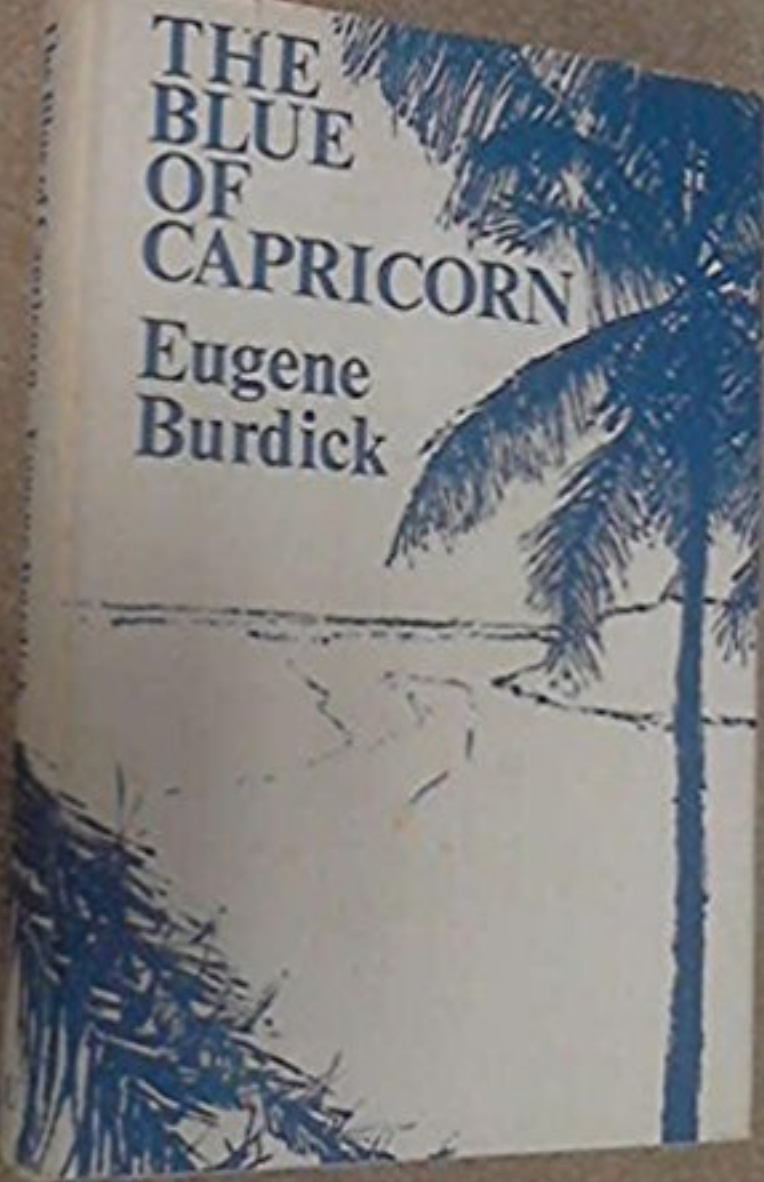
بحرالکاہل کے راز

دنیا کے عظیم ترین سمندر میں چھپے ہوئے
عجائبات کی سنسنی خیز کہانی
ہوشربا تفصیلات کے ساتھ ——
مشہور مصنّف
یوجین برڈک کی تصنیف
"دی بلیو آف کیپریکارن"
کی تلخیص

احمد الشہابی
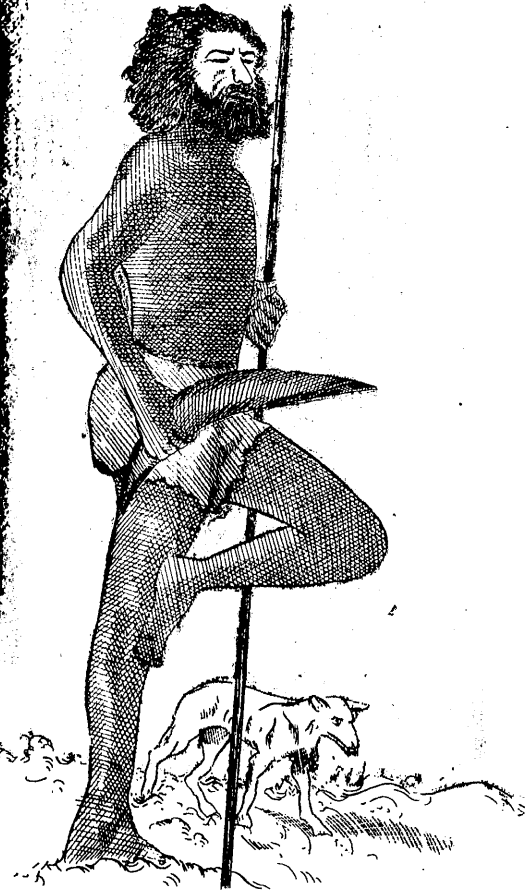
میری زندگی کا بیشتر حصّہ بحرالکاہل کی موجوں پر سفر کرتے، یا اُس کے جزیروں میں گزرا ہے۔ اس کے باوجود میں اُسے پُوری طرح سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ یہاں ہزاروں جزیرے موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں جن میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔

بحرالکاہل دنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اگرچہ شمال میں اس کی وسعت چھیالیس درجے عرض بلد تک ہے، مگر تکنیکی لحاظ سے آگے کا منجمد سمندر بھی اسی کا حصّہ شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں دھند میں لپٹے جزائر ایلیوشن اور برف پوش ٹنڈرا کے علاوہ اسکیمو، آئس برگ، یعنی برف کے عظیم تودے اور سیل مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔

بحرالکاہل کی جنوبی حد آسٹریلیا کا جزیرہ تسمانیہ ہوسکتی ہے جس کی جنوبی بندرگاہ پورٹ آرتھر سے آگے قطب جنوبی کی یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بحرالکاہل شمال میں آبنائے بیرنگ سے لے کر جنوب میں انٹارکٹیکا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مشرق میں برِاعظم امریکہ ہے اور مغرب میں آسٹریلیا اور ایشیا کے ساحل۔

یہ سمندر ہر وقت بے قرار رہتا ہے۔ منڈاناؤ اور ٹونگا کی گہرائیوں سے استوا کا گرم نمکین پانی آہستہ آہستہ شمال کا رخ کرتا ہے اور جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اُس میں تیزی آتی جاتی
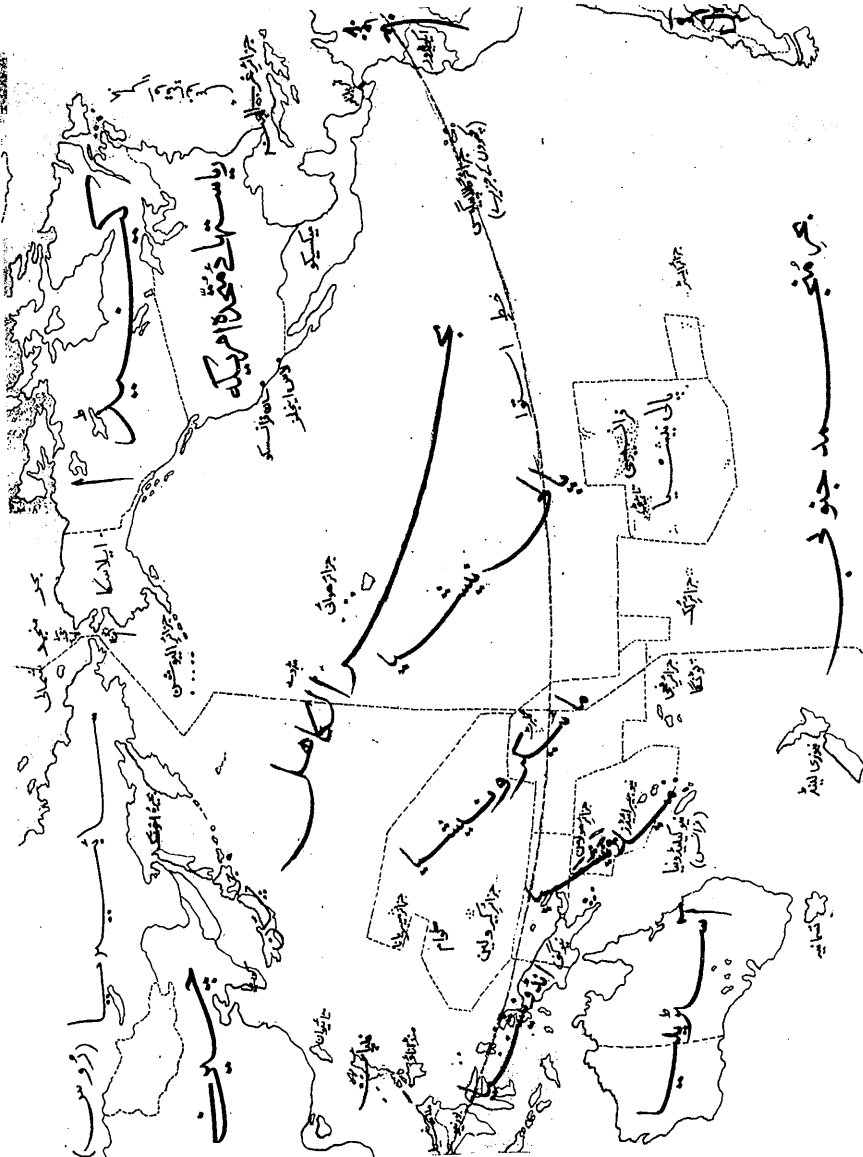
ہے۔ پھر وہ کیوروشیو کی سمندری رو میں مل کر مزید تیزی اختیار کرلیتا ہے۔ یہ سمندری رو دریائے مسیسپی کی رفتار سے سو گنا زیادہ تیز ہے۔ شمال میں اس کا آمنا سامنا اویاشیو کی سرد رو سے ہوتا ہے جو بحیرۂ اخوتسک اور آبنائے بیرنگ سے جنوب کی طرف سفر کرتی ہے۔ اس ٹکراؤ کا نتیجہ کثیف دُھند کی صُورت میں نکلتا ہے۔ کیوروشیو ہزیمت اٹھا کر بہت بڑے نیم دائرے کی صورت میں ساحلِ امریکہ کا رُخ کرتی ہے۔ سیٹل اور سان فرانسکو کی بارشیں اسی کی مرہونِ منت ہیں۔ لاس اینجلز اس رو سے اُٹھنے والی مرطوب ہواؤں سے محروم رہتا ہے۔ کیوروشیو آخری موڑ مڑتی ہُوئی نو ہزار میل کا طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد فلپائن کی گہرائی میں مدغم ہو جاتی ہے۔

جاپان کے سوا جزائرِ بحرالکاہل کے قدیم باشندے ہنرمندی کی خصوصیت سے محروم نظر آتے ہیں۔ وہ لکھنے پڑھنے اور پیمائش کے علم سے ناواقف تھے۔ اُن کی تاریخ مختصر اور تمدّنی و سیاسی پس منظر سے بالکل خالی ہے۔

نفرت، بُغض اور غصّہ اُن لوگوں کے رگ وپے میں سمایا ہُوا ہے۔ پاپیتی کا مقامی باشندہ کسی دوسرے شخص کو پتھر مار کر ہلاک کر دے، تو تعجّب کی بات نہیں۔ وہ عدالت میں آکر کچھ اس طرح کا بیان دے گا کہ مقتول نے اُس کے باغیچے کے قریب پیشاب کرنے کی جسارت کی، اُس نے مجھے گھُور کر دیکھا اور مَیں نے پتھر مار کر اُس کا بھیجا نکال دیا۔

چوری چکاری وہاں عام ہے۔ اسے جُرم کے بجائے تفریح خیال کیا جاتا ہے۔ قدیم باشندے تہذیب و تمدّن سے تقریباً عاری ہیں۔ اُن کے نزدیک سمندر، ہوا، موجیں اور کشتیاں ہی سب کچھ ہیں۔

عجوبۂ روزگار

بظاہر بحرالکاہل ایک پُرسکون سمندر ہے۔ ڈائمنڈ ہیڈ سے دیکھیں، تو آبنائے کیوائی کی سطح مہینوں کسی ہلچل کے بغیر نظر آتی ہے۔ بورنیو کے کسی پہاڑ کی چوٹی سے جزائر سولو (فلپائن) کی طرف نگاہ دوڑائی جائے تو یہ سمندر پگھلے سیسے کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ سیموا سے شمال اور مشرق کی سمت ایک ہی طرح کی موجیں اُٹھتی رہتی ہیں جو نزدیک ترین پتھریلے ساحل پر دھیمے انداز میں جھاگ اُڑا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

بحرالکاہل، اس کی آب و ہوا اور جزیروں کا کسی دوسرے سمندر سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کی سب سے گہری سمندری کھائیاں منڈاناؤ اور میریانا یہیں موجود ہیں۔ یہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی ۳۵ ہزار فٹ (تقریباً ½ ۶ میل) تک پہنچتی ہے۔

طبقات الارض کے ماہرین نے معلوم کیا ہے کہ بحرالکاہل کی زیرِ آب سطح بسالٹ کی تہہ پر مشتمل ہے اسے قشرِ ارض کی وسطی تہہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے سمندروں میں گرینائٹ کی تہہ پھیلی ہُوئی ہے۔ بہت سے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ زمین کی تخلیق کے ابتدائی زمانے میں یہاں سے خشکی کا بہت بڑا ٹکڑا اجڑا ہُوا جس نے ٹھنڈا ہونے پر چاند کی صُورت اختیار کرلی۔ زمین پر وسیع خلا بعد میں پانی سے بھر گیا جو اب بحرالکاہل کہلاتا ہے۔

بحرالکاہل میں خاص خاص سمتوں میں گرم اور سرد پانی کی رو ئیں چلتی ہیں۔ گرم رووں کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ بعض اوقات کشتیاں ہوا کے بغیر دن بھر میں پچھتّر سے سو میل تک طے کرلیتی ہیں۔ قدیم پولینیشی باشندے ان رووں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے۔ خطِ استوا کے شمال اور جنوب میں گرم پانی کی دو استوائی روئیں بہتی ہیں۔ انتہائی جنوب میں بہنے والی سرد رَو "ساؤتھ پیسیفک ڈرِفٹ" کہلاتی ہے۔

یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکا کہ بحرالکاہل میں طوفان یا گردباد کن طبیعی عوامل کا نتیجہ ہوتے ہیں، تاہم بعض ماہرینِ ارضیات کہتے ہیں کہ جب خطِ استوا کی گرم ہَوا بل کھاتی ہُوئی اُوپر اٹھتی ہے، تو سمندر کی سطح پر طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ایک گردباد کم از کم بیس میل اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار میل کی وسعت رکھتا ہے جس میں ہَوا کی رفتار پچھتّر سے ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

مَیں ایک بار تباہ کُن جہاز پہ بحرالکاہل میں سفر کر رہا تھا کہ طُوفان نے آلیا۔ ہَوا کی رفتار ۱۲۵ میل فی گھنٹہ تھی۔ دیو ہیکل جہاز بے قابو ہو کر ڈولنے لگا۔ وہ کبھی ایک طرف مُڑ جاتا، تو کبھی دوسری طرف۔ موجوں کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ خُدا خُدا کر کے طوفان تھما تو معلوم ہُوا کہ چھ آدمیوں کے بازو اور ایک کی ٹانگ ٹُوٹ چکی ہے۔ ایک شخص کا سر زخمی ہُوا

اور کوارٹر ماسٹر کا انگوٹھا کٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا۔

بحرالکاہل اتنا وسیع سمندر ہے کہ شاذونادر ہی کوئی طُوفان کسی بڑے جزیرے تک پہنچ پاتا ہے۔ اکثر طُوفان بحری موجوں کے درمیان ہی دم توڑ دیتے ہیں؛ البتّہ کبھی کبھی گردباد خشکی پر آدھمکتا ہے جس کے نتیجے میں زبردست تباہی پھیلتی ہے۔ ربڑ کے ذخیرے ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہوتے ہیں اور ان درختوں کا ہزاروں ٹن "دُودھ" بہہ کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی بدقسمت شخص ناریل کے جُھنڈ کے آس پاس موجود ہو، تو مشکل سے جان بچا پاتا ہے۔ اُڑتے ہوئے ناریل توپ کے گولوں کی طرح اُسے چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ فجی میں ایک شخص نے مجھے کاؤری نامی درخت کا تنا دکھایا۔ اُس میں بوتل کی سی شکل بنی ہُوئی تھی۔ اُس شخص کا کہنا تھا کہ طوفان کے وقت ایک بوتل اتنے زور سے تنے کے ساتھ ٹکرائی کہ اس میں کھُب کر رہ گئی۔

بحرالکاہل میں ہر سال تقریباً ایک سو تیس طُوفان آتے ہیں اور "سونامی" طوفان ہلاکت خیزی میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ زیرِ آب زلزلے سے اُٹھتا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں انڈونیشیا کا جزیرہ کراکاٹوا اسی قسم کے آتش فشانی دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اُس کا دھماکہ کئی ہائیڈروجن بموں سے زیادہ تھا جس کے نتیجے میں سو سو فٹ بلند لہریں اٹھیں جو ہزاروں میل دُور مختلف جزیروں کے باشندوں کو بہا لے گئیں۔ گرد و غبار کے گہرے بادلوں نے قریب قریب پُورے کُرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس قیامتِ صغریٰ میں تیس ہزار انسان ہلاک ہُوئے۔

سنہ ۱۹۴۶ء کے موسمِ گرما میں جزیرہ ہوائی اسی قسم کے طوفانوں کی زد میں آیا جس میں ایک سو پچاسی آدمی ہلاک ہُوئے اور اڑھائی کروڑ ڈالر کی املاک تباہ ہو گئیں۔ ساحل کے ساتھ واقع ایک سُپر مارکیٹ پانی میں بہہ گئی اور بیسیوں کاریں لہروں کے ساتھ لڑھکتی، دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چُور ہو گئیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ایک تباہ کُن بحری جہاز دیو قامت موجوں میں پھنس گیا۔ ایک موج نے اُسے تنکے کی طرح اُچھالا اور پھر اس انداز میں سمٹی کہ جہاز ہَوا میں معلق ہو کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ بہت سے ملّاحوں نے ہزاروں ٹن وزنی اس جہاز کو دو ٹکڑے ہو کر پانی میں گرتے دیکھا۔

پرندوں کی کھاد

بحرالکاہل میں سفر کرنے والا صرف تین چیزیں دیکھ سکتا ہے۔ وہ ہیں جہاز، پانی اور خلا۔ قدیم زمانے کے لوگ اپنے آپ کو بے بس خیال کر کے خلا یا آسمان پر نظریں جمائے رکھتے تھے جب کہ آج کا انسان محفوظ جہازوں میں سفر کرتا ہے اور خوف سے بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود بحرالکاہل کی فضا کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جو بادلوں اور رنگا رنگ پرندوں سے بھری ہُوئی ہے۔ یہاں سمندری بگلے پر پھڑپھڑائے بغیر گھنٹوں جہاز کے ساتھ ساتھ اُڑتے نظر آتے ہیں اور جیسے ہی کُوڑا کرکٹ سمندر میں پھینکا جاتا ہے، وہ چکر کاٹ کر اس پر بے صبری سے جھپٹتے ہیں اور چونچیں مار مار کر غذا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بحرالکاہل کی فضا میں کئی طرح کے پرندے پائے جاتے ہیں۔ ان میں قادوس نامی پرندہ دن بھر بہت بلندی پر اُڑتا ہے، لیکن رات کے وقت نیچے اُتر کر چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے۔ بعض سمندری پرندے مختلف موسموں میں خاص سمت میں سفر کرتے ہیں۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ پولینیشی باشندے گولڈن پلوور نامی پرندے کے فضائی راستے سے جزائر ہوائی تک پہنچنے میں کامیاب ہُوئے تھے۔ کچھ جہاز ران کوئل کے راستے پر سفر کرتے ہُوئے جزائر سولومن سے نیوزی لینڈ پہنچے تھے۔

ہوائی کا پٹرل نامی ایک چھوٹا سا پرندہ اس حالت میں سمندری لہروں کے ساتھ ساتھ اُڑتا رہتا ہے کہ اُس کے پنجے پانی کو چھُوتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ پَر پھیلائے لہروں پر چل رہا ہے۔ یہ پرندہ جھاگ کے گالوں سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے جو سمندری گھاس وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ رات کے وقت یہ پرندے جہاز کی روشنی پر کھنچے چلے آتے ہیں اور مستول کے گرد چند منٹ چکر لگانے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔

گونی برڈ سفید جسم اور سیاہ پروں والے پرندے ہیں۔ ویک اور مڈوے کے جزیرے اُن کا اصل گھر ہیں۔ بدقسمتی سے ان پرندوں کی خطرہ محسوس کرنے والی حِس بہت کمزور ہے۔ وہ غول در غول ایک ہی سمت میں اُڑتے ہیں۔ اگر اُن کے راستے میں کوئی عمارت یا اسی طرح کی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے تو اُس

ٹی، وی پروگرام "نیلام گھر" میں ایک بار نئے شادی شدہ جوڑے اسٹیج پر بُلائے گئے اور بیویوں کو بولنے کے لیے موضوع دیا گیا: "اگر مَیں شوہر ہوتی، تو..." اور شوہروں کا موضوع تھا: "اگر مَیں بیوی ہوتی تو..."

ایک صاحب نے تیزی سے بولنا شروع کر دیا: "اگر مَیں شوہر ہوتا، تو ٹھیک پانچ بجے دفتر سے گھر آجاتا۔ یہ کرتا، وہ کرتا..." (گویا اُنھیں اپنے شوہر ہونے میں شک تھا) پھر ایک دم بوکھلا کر پُوچھنے لگے: "میرا موضوع کیا تھا؟"

کے ساتھ اس بُری طرح ٹکراتے ہیں کہ ایک آدھ ہی زندہ بچتا ہے۔ یہ پرندے کچھ اس طرح لکیر کے فقیر ہیں کہ کسی حالت میں بھی اپنا رُخ تبدیل نہیں کرتے۔ عمارتوں وغیرہ کے ساتھ جب ان خُوب صُورت پرندوں کا کوئی غول ٹکراتا ہے، تو بڑا رقت انگیز منظر ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں یہ معصوم جانور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں۔

سفید پروں والے بوزن نامی پرندے خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اپنے طاقت ور بازوؤں کے سہارے سینکڑوں میل تک پرواز کر سکتے ہیں۔ عجیب محرومی ہے کہ یہ پرندہ چل پھر سکتا ہے نہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ نیچے اُترتے وقت وہ گولے کی طرح زمین پر آگرے گا۔ شاید اسی کمزوری کے باعث نر اور مادّہ فضا میں ملاپ کرتے ہیں۔ مادّہ خشکی کے کسی محفوظ مقام پر انڈے سیتی ہے۔

بحرالکاہل کا عقاب نہایت خُوب صُورت پرندہ ہے۔ اُس کے بازوؤں کی لمبائی سات فٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ کافی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ ایک بار مَیں نے اُسے سینکڑوں فٹ کی بلندی سے مچھلی پر جھپٹتے دیکھا۔ وہ کامیاب حملے کے بعد شکار کو پنجے میں دبائے آسمان کی وسعت میں کھو گیا اور اتنا اونچا اُڑا کہ مجھے دُوربین استعمال کرنی پڑی۔ ایک نرالی بات یہ دیکھی کہ بلندی پر پہنچ کر اُس نے مچھلی چھوڑ دی اور پھر غوطہ مار کر اُسے پنجوں میں دبوچ لیا۔ بار بار یہ شغل دُہرانے سے مچھلی مر گئی، تو اُسے ہڑپ کر گیا۔

ہوائی میں اس عقاب کو ایوا کہا جاتا ہے جس کے معنی چور اور ڈاکو ہیں۔ وہ اکثر دوسرے پرندوں کا شکار چھین لیتا ہے۔ شام کے وقت ایوا کا غول چُپکے سے اُن پرندوں پر جھپٹ پڑتا ہے جو اپنے بچوں کے لیے خوراک لے جا رہے ہوتے ہیں۔ کمزور پرندے اس اچانک حملے سے گھبرا جاتے ہیں اور ساری خوراک گرا دیتے ہیں جسے ایوا پانی پر گرنے سے پہلے ہی اُچک لیتے ہیں۔

سمندر میں سفر کرتے ہُوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پرندوں میں جُہد للبقا کی سخت جنگ جاری ہے، اسی لیے اُن کی بہت سی قسمیں ناپید ہو چکی ہیں اور کئی ایک اس خطرے سے دوچار ہیں۔ کیوی ان میں سے ایک ہے۔ یہ پرندہ اُڑنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ڈوڈو نامی پرندہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہو چکا ہے۔ اُس کے ختم ہو جانے کی بڑی وجہ بھی قوتِ پرواز سے محرومی تھی۔

جزائرِ بحرالکاہل میں آبسنے والے "جہازی چُوہے" بھی چھوٹے موٹے پرندوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں۔ وہ پرندوں کے مغز چٹ کرنے کے بعد باقی دھڑ چھوڑ دیتے ہیں۔ طوفان کے باعث بھی بے شمار پرندے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات طوفان کے بعد جزیرہ لیسان کی سڑکوں پر اتنے مُردہ پرندے پڑے ہوتے ہیں کہ باقاعدہ صفائی کیے بغیر گاڑی چلانا ممکن نہیں رہتا۔

اُن بحری پرندوں کی بیٹ جو مچھلی کھاتے ہیں، نہایت عمدہ کھاد تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی بڑی مقدار تو سمندر کی نذر ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی خشکی پر یہ کافی مقدار میں بچ رہتی ہے۔ طبعی تبدیلیاں اسے لائم فاسفیٹ میں بدل دیتی ہیں، جو بہترین کھاد ہے۔ جزائر اوشن اور نورو کے باشندے اُسے بلڈوزروں سے کھود کر کام میں لاتے ہیں۔ نورو میں تو یہ کھاد زرِ مبادلہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جزائر گالاپیگوس، بیکر اور جاروِس میں پرندوں کی بیٹ اکٹھی ہونے دی جائے تو وہاں زمین کی سطح کافی اونچی ہو جائے۔

حیرت انگیز بادل

بحرالکاہل میں بعض اوقات بادل کا ایک ٹکڑا اور جہاز متوازی حالت میں کئی کئی دن ایک ساتھ سفر کرتے رہتے ہیں۔ نمبس نامی سیاہ بادل یقینی بارش کی علامت ہوتا ہے۔ ہر جزیرے پر اس کے رقبے کے لحاظ سے مختلف انواع کے بادل معلق رہتے ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگ دُور ہی سے ان کو پہچان کر معلوم کر لیتے تھے کہ آگے کون سا جزیرہ آنے والا ہے۔

نیوگنی کا ایک پہاڑی گاؤں کافی بلندی پر واقع ہے۔ یہ سال بھر بادلوں میں گھرا رہتا ہے۔ اُس کے باشندے خوف کے علاوہ چند قدیم توہمات کے باعث پہاڑی سے کبھی نیچے نہیں اُترتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بادلوں سے گہری شناسائی کے باوجود اُن کی زبان میں بادل کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ اُن کی محدود دنیا صدیوں سے فطرت کے سادہ اور ابتدائی اصولوں کے مطابق گزرتی ہے۔

کاوائی کے ماؤنٹ ویلیل پر ہر وقت ایک ہی قسم کا بادل چھایا رہتا ہے۔ اس پہاڑ پر ۴۶۰ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سے صرف پندرہ میل دُور کا علاقہ تقریباً بنجر اور بے آب و گیاہ ہے جہاں بیس انچ سالانہ سے بھی کم بارش برستی ہے۔

تاہیٹی سے سات میل دُور موریا کا خوب صُورت جزیرہ ہے۔ یہاں دو پہاڑیاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں، لیکن دُھند نما بادل کا ایک ٹکڑا اُنھیں ہمیشہ آپس میں مربُوط رکھتا ہے۔ اور یہ بادل دن میں کئی رنگ بدلتا ہے۔

بحرالکاہل پر بھاپ کے بادل بکثرت اُٹھتے ہیں اور یہ کرشمہ ہے آتش فشاں پہاڑوں کا۔ اب تک، ایک اندازے کے مطابق، مونالوا کے آتش فشاں سے کوئی پچاس کروڑ ٹن لاوا نکل چکا ہے۔ بہتا ہُوا لاوا درختوں اور گھروں کو اجاڑتا ہُوا سمندر میں گرتا ہے، تو خوف ناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ بڑی بڑی لہریں اژدہوں کی طرح پھُنکارتی ہُوئی اُٹھتی ہیں۔ بھاپ کے دبیز بادل پیدا ہوتے ہیں اور اگر آتش فشانی رات کے وقت ہو تو سماں زیادہ ڈراؤنا ہوتا ہے۔ شور مچاتا، بھاپ اُڑاتا آگ کا دریا سمندر میں گرتا ہے تو گویا قیامت بپا ہو جاتی ہے۔

آج مغربی دُنیا کے باشندے سُورج، چاند اور ستاروں کے اثرات سے کم ہی آشنا ہیں، کیونکہ وہ ایئر کنڈیشنڈ بند گھروں میں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بحرالکاہل کے جزیروں میں براہِ راست ان کا سامنا ہوتا ہے۔ جزائر گلبرٹ یا ملکا (انڈونیشیا) میں خطِ استوا پر سُورج شدّت سے چمکتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے وہ زمین کے بالکل قریب آگیا ہے۔ آسمان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی، کیونکہ آنکھیں چندھیا کر رہ جاتی ہیں۔

ایک بار مَیں نے ایک سفید فام شخص کو دیکھا جو کسی وجہ سے تین گھنٹے دُھوپ میں رہا تھا۔ اُس کی پیٹھ کا چمڑہ آبلوں سے بھر گیا تھا۔ بازوؤں پر بھی بڑے بڑے چھالے پڑ گئے تھے یہاں تک کہ اُس کا سُرخ ہیٹ دُھوپ کی شدت سے سفید ہو گیا تھا۔

زیرِ آب عجائبات

بحرالکاہل کی زیرِ آب سطح عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ سطح کہیں مرتفع ہے اور کہیں گہری۔ یہاں سب سے طویل سمندری سطح مرتفع البٹراس ہے جو جنوبی امریکہ اور جزائر ٹواموٹو سے ہوتی ہُوئی انٹارکٹیکا کے برف پوش ساحل تک چلی گئی ہے۔ بحرالکاہل کے جزائر اسی بحری سطح مرتفع کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جزیرہ ہوائی میں مونا کی نامی پہاڑ (سمندر سے ۱۳۸۲۵ فٹ بلند) ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی دو ہزار فٹ زیادہ اُونچا ہے۔ (غالباً مصنّف کے پیشِ نظر یہ امر ہے کہ دُنیا کی بلندترین پہاڑی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سطحِ سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ اُونچی ہے، لیکن سطح مرتفع تبّت سے اُس کی خالص بلندی تقریباً بارہ ہزار فٹ بنتی ہے۔ یُوں مونا کی، ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی دو ہزار فٹ بلند رہتا ہے) بحرالکاہل میں تین سو سے زائد آتش فشاں ہیں جو سمندر سے اُبھرنے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتے ہیں۔ آتش فشانی کے عمل سے یہاں نئے جزیرے بھی وجود میں آتے رہتے ہیں۔

یہ خیال نہ کیجیے کہ اس عظیم سمندر کی لہروں پر صرف وحشت یا تنہائی ہی کا راج ہے۔ نہیں، اس میں اور بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے مثلاً اس کی پُرشور موجوں میں لاکھوں ٹن سونے، چاندی، نمک اور نکل کے ذرّات موجود ہیں۔ یہاں اتنی مچھلی، جھینگے اور غذائیت سے بھرپُور سبز کائی (ایلجی) پائی جاتی ہے کہ جب سے نسلِ انسانی عالمِ وجود میں آئی ہے، سب انسانوں پر انہیں تقسیم کر دیا جائے، تو ہر شخص کے حصّے میں سال بھر کا راشن آئے۔

یہاں پلینکٹن کثرت سے ملتا ہے جسے مچھلیاں بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ بظاہر اس پودے نما مخلوق میں زندگی کے آثار نہیں لیکن حقیقتاً وہ ایک زندہ چیز ہے۔ سمندر کے بعض حصّوں میں پلینکٹن اتنی بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ پانی میں اُسی طرح دکھائی دیتا ہے جیسے آسمان پر بادل۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے لے کر وہیل تک اسے شوق سے کھاتی ہیں۔ پلینکٹن ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی

"گھومنے پھرنے" کے ہیں۔

سمندر کی سطح سے دو سو فٹ نیچے تک ہر وہ مچھلی پائی جاتی ہے جس سے ہم متعارف ہیں۔ خوراک کا ذخیرہ بھی زیادہ مقدار میں اسی گہرائی میں ہے، لیکن اس کے باوجود وہیل مچھلیاں خاصی گہرائی تک چلی جاتی ہیں۔ انہیں سطحِ سمندر سے پندرہ سو فٹ نیچے ایک دوسری سے خوفناک انداز میں لڑتے دیکھا گیا ہے۔

چاند اور سمندر کی لہروں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ چاند صرف سمندر میں مدوجزر ہی پیدا نہیں کرتا، بلکہ سمندری زندگی پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ پلولو ورم نامی ایک کیڑا چاندراتوں میں کروڑوں، اربوں کی تعداد میں سمندر کی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ اُن کی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سطحِ سمندر پر اُن کی کئی فٹ دبیز تہہ بن جاتی ہے۔

سمندر کی انتہائی گہرائیوں میں بھی زندگی موجود ہے۔ سینکڑوں فیدم کی گہرائی پر پلینکٹن، جھینگے اور مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو ہزاروں مربع میل میں پھیلی ہوتی ہیں۔ جہاں کروڑوں ٹن پانی کے دباؤ سے دھات کی گولی بھی ریزہ ریزہ ہو جائے، وہاں رہنے والی بحری مخلوق اس دباؤ کی عادی ہو جاتی ہے۔

دلدلی کچھوے

یہاں کی دلدلیں دُنیا بھر میں سب سے قدیم ہیں۔ اگر کوئی شخص نیو برٹن کی دلدل سے اُٹھتی ہُوئی بدبُو سونگھ لے، تو نیویارک جا کر بھی غیر شعوری طور پر اپنی ناک پر رومال رکھتے رہے گا۔ یہاں کے قدیم باشندے بھی ایسی دلدلوں کے قریب رہنے کی جرأت نہیں کرتے۔ دُوربین کے ذریعے دیکھیں تو وہاں بڑے بڑے کچھوے رینگتے نظر آئیں گے۔ ویسے یہاں ایک بہت خوب صُورت پرندہ بھی رہتا ہے جس کی سُریلی آواز دل میں گداز پیدا کرتی ہے اور غور کریں، تو یہ بات بھی عجائبات سے ہے۔

ڈارون کے ہم عصر مشہور سائنس دان الیفرڈ رسل ویلس نے انڈونیشیا کے دو جزائر بورنیو اور سیلیبز کے درمیان ایک جغرافیائی لکیر کھینچی جو بحیرۂ جاوا سے ہوتی ہوئی بالی اور لومبک کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے۔ بورنیو ایشیائی نوعیت کا جزیرہ ہے جبکہ سیلیبز کے برّی مناظر آسٹریلیا سے خاصی مماثلت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے حیوانات اور نباتات میں بھی نمایاں فرق ہے۔

گڑیا یا درخت

جزیرہ نیوگنی میں پھولوں اور پودوں کی اڑھائی ہزار سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ اگر ان میں درخت، جھاڑیاں اور جڑی بُوٹیاں بھی شامل کر لی جائیں تو یہ تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر جائے گی۔ اس کے مقابلے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پودوں کی تعداد چھ ہزار سے زائد نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ بحرالکاہل کے جزائر پر مَن و سلویٰ اُترتا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں جنگلی کیلا اتنی مقدار میں پیدا ہوتا ہے کہ اُسے استعمال کرنا ممکن نہیں۔ یہ درختوں سے گر کر یونہی ضائع ہو جاتا ہے۔ راستوں کے دونوں جانب گلے سڑے پھل سے کئی کئی فٹ بلند سطح بن جاتی ہے۔

سولومن، فلپائن، نیوگنی اور بورنیو میں ایک ہی طرح کے گھنے جنگل پائے جاتے ہیں جن میں قدیم نسل کے بونے آباد ہیں۔ وہ ایسے گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں کہ وہاں سورج کی کرنیں زمین تک نہیں پہنچ سکتیں، چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اُن لوگوں نے آج تک سُورج کی شکل نہیں دیکھی۔ یہاں اگرچہ بہت بلند درخت پائے جاتے ہیں، لیکن اُن کا تنا نہایت نازک ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے

بحرالکاہل میں ہزاروں جزیرے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن پر ابھی تک کوئی متمدن انسان نہیں بسا اور نہ ہی ان جزیروں کے قدیم باشندوں کے درمیان زمین کی خاطر کبھی لڑائی ہُوئی۔

جنگِ عظیم دوم کے شعلوں نے ان جزائر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تب کہیں پُرانے باشندوں کو معلوم ہُوا کہ زمین کے حصول کے لیے لڑا بھی جاتا ہے۔ اس سے پہلے زمین کی ملکیت کا وہاں کوئی تصوّر نہ تھا۔ جس کا جی چاہتا زمین صاف کر کے فصل بو دیتا۔ لیکن ۱۹۴۵ء کے بعد سے وہاں بڑے بڑے فارم بن گئے ہیں جو خریدے اور فروخت کیے جاتے ہیں۔

بحرالکاہل کے جزیرے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو طبعی طور پر کسی برِّاعظم کا حصّہ ہیں۔ دوسرے وہ جو زیرِآب آتش فشانی کے نتیجے میں پیدا ہُوئے۔ چٹانیں سمندری موجوں کے عمل سے ٹُوٹتی پھُوٹتی رہتی ہیں اور عام حالات میں اُن پر نمک کی دبیز تہہ چڑھتی ہوتی ہے۔

رکنِ ایوانِ نمائندگان جاپان جنتسُو انا کاگی
۱۸ اگست ۱۹۸۱ء کو جاپان اسلامک کانگریس کے زیرِ اہتمام ٹوکیو کی مسجد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اُن کا اسلامی نام عبدالعظیم رکھا گیا ہے ——— جناب عبدالعظیم انا کاگی حکمران جماعت لبرل ڈیمو کریٹک پارٹی کے فارن افیئرز ڈویژن کے وائس ڈائرکٹر ہیں۔ وہ ساتویں رکنِ پارلیمنٹ ہیں جو مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔
(ہفت روزہ "پاناما"، ۲۷ اگست ۸۱ء)

دیکھا تقریباً دو سو فٹ بلند درخت کلہاڑی کی ایک ہی ضرب سے زمین بوس ہو گیا۔ ان درختوں پر آکاس بیل اور کئی اور طرح کی بیلیں لپٹی ہوتی ہیں اور تنوں پر سفید سفید تھیلے سے لٹکے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک درخت سے لٹکتا ہوا پھپھوندی (فنجائی) کا بہت بڑا تھیلا دیکھا جو ایک طویل کار کے برابر تھا لیکن اتنی ضخامت کے باوجود اُس کا وزن بیس تیس پاؤنڈ سے زیادہ نہ تھا۔

بکثرت بارش ہونے کے باعث یہ جنگل ہر وقت کیچڑ سے بھرے رہتے ہیں۔ مینہ تھمنے کے گھنٹوں بعد بھی نیم گرم پانی کی بوندیں درختوں سے ٹپکتی رہتی ہیں۔ اگر بارش برسنے میں کئی دن کا وقفہ ہو جائے، تو درختوں سے رال کی مانند گاڑھا مادہ بہنے لگتا ہے۔ درخت اس قدر گھنے ہیں کہ آواز کی بازگشت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

اس خطے کے باشندے ایک خاص درخت "فرن" کے تنے سے انسانی شکل بناتے ہیں جو آدمی کے قد و قامت سے دُگنی ہوتی ہے۔ ایک ماہ بعد یہ سُکڑ کر گڑیا کے برابر رہ جاتی ہے اور اگر ایک سال بعد دیکھیں تو محض چند انچ کی دکھائی دے گی جسے آپ ڈرائنگ رُوم کی زینت بنا سکتے ہیں۔

زہر کی پھوار

ان جزیروں کے برساتی جنگلوں اور دلدلی علاقوں سے گزرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہاں خُون چُوسنے والی جونکیں پائی جاتی ہیں جو غیر محسوس طور پر جسم سے چمٹ جاتی ہیں اور اگر اُنہیں کھینچ کر جلد سے جُدا نہ کیا جائے تو بہت سا خُون پی لیتی ہیں اور زخم کئی ماہ بعد مندمل ہوتا ہے۔ جسم سے چمٹی ہُوئی جونکیں نمک ڈالنے یا سگریٹ سے داغنے پر الگ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

ان جنگلوں میں کئی طرح کی ضرر رساں چھپکلیاں بھی پائی جاتی ہیں جو انسانوں اور حیوانوں کا خُون چُوس کر گزارہ کرتی ہیں۔ اگر اُنہیں نوچ کر جُدا کیا جائے تو اُن کا سر جلد میں پیوست رہ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اقسام کی خُونی مکھیاں، مچھر اور بچھو رینگتے نظر آتے ہیں۔ کئی قسم کے زہریلے سانپ مثلاً ناگ، بوا اور افعی پائے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کے ایک سانپ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے شکار کو ڈسنے کے بجائے اس پر دُور سے زہر پھینک کر ہلاک کر دیتا ہے۔

۱۹۵۰ء میں کنٹاس ایئر لائنز کے کپتان پگ برچ کو رات کے وقت ہنگامی صورت میں جزیرہ بوگینویل کی ٹُوٹی پھُوٹی ہوائی پٹی پر اُترنا پڑا۔ وہ صبح اپنے طیارے سے نکلا تو قریبی رن وے پر پی ۳۸ قسم کے بیس طیارے کھڑے دکھائی دیے۔ اُنہیں چار سال پہلے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ طیارے زنگ آلود ہو چکے تھے اور اُن کے ٹائروں کو مٹی کھا چکی تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اُن کے پنکھے گردش کرنے لگتے۔ شاید یہ وہاں اس لیے چھوڑ دیے گئے تھے کہ اُنہیں واپس لے جانا ممکن نہ رہا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بحری دستے چند جزائر پر اُتارے گئے۔ وہ تربیت یافتہ فوجی تھے اور مواصلات کے لیے اُن کے پاس متعدد وائرلیس سیٹ تھے، لیکن یہ سازوسامان اُن کے کام نہ آ سکا۔ گھنے جنگل میں دو فوجی قافلے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اُنہیں ہوائی جہازوں اور روشنی کے

گولوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وائرلیس پر بھی متعدد پیغام نشر کیے گئے، لیکن اُن میں رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ کئی دن کی جدّوجہد کے بعد وہ ایک دوسرے سے ملے تو نقشوں کے موازنے سے معلوم ہُوا کہ دونوں ایک دوسرے سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر تھے۔ آسٹریلیا کے کئی فوجی یہاں اس طرح غائب ہُوئے کہ دوبارہ نہ مل سکے۔ خیال کیا گیا کہ وہ اُن آدم خور قبائل کے ہتھے چڑھ گئے ہوں گے جنہیں اگر بیٹو کہا جاتا ہے۔

میلانیشیا

بحرالکاہل سے آیوڈین، نمک اور املی کی بُو ہر وقت اُٹھتی رہتی ہے۔ جزیرہ فجی کا دارالحکومت سووا ناریل کی بُو باس میں رچا بسا رہتا ہے۔ اگر آپ کو ونیلا یا لوبیا کی خوشبو آئے، تو سمجھ لیجیے کہ آپ کا جہاز ماؤری اور تاہیٹی کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ ہونولولو (ہوائی) مکمل طور پر ایک مغربی شہر ہے۔ یہاں سیب کی خوشبو میں رچے بسے جھونکے آپ کا استقبال کرتے ہیں۔

انڈونیشیا اور جزائر فلپائن کے بعض حصّوں میں ناگوار بُو چھائی رہتی ہے جو ربڑ کے جنگلات اور سمندر سے اُٹھتی ہے۔ ایک امریکی سفارت کار سے میری مُلاقات ہُوئی جو اس سے پہلے افریقہ اور شرقِ اوسط میں رہ چکا تھا۔ اُس کا کہنا تھا: "میں اور میرے بچے بحرالکاہل کی بُو سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے"۔ وہ چند دن بعد اپنے بال بچّے لے کر واپس امریکہ چلا گیا۔

میلانیشیا ایک بہت بڑی بحری پٹی ہے جس میں جزائر فجی، نیو کیلیڈونیا، نیو ہیبرائڈز، سولومن، جزائر بسمارک اور نیوگنی شامل ہیں۔ میلانیشیا کا مطلب ہے "کالے جزائر"۔ ان میں سے ایک جزیرہ رینل ایسا ہے جس میں میلانیشی نسل کے بجائے دراز قد پولینیشی آباد ہیں۔ نیگرو نما میلانیشی، پولینیشی، ملائی اور کاکیشیائی خُون سے ملی جُلی نسل سے ہیں۔ اکثریت کا رنگ سیاہ ہے، لیکن اُن میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی رنگت بھُوری سنہری ہے۔

میلانیشیا میں سینکڑوں جزیرے ہیں کئی قسم کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں آپ کو ایسے علاقے ملیں گے جہاں ہر پانچ میل کے بعد ایک نئی زبان بولی جاتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی شکل تک سے ناواقف ہیں۔ یہاں ایسے جزیرے بھی ہیں جن میں مرطوب جنگلوں اور بے آب و گیاہ ویرانوں کا تنوع ملتا ہے۔ کہیں وحشی اور خونخوار قبائل آباد ہیں، تو کہیں مہمان نواز اور خوش اخلاق لوگ۔

میلانیشیا کے قدیم باشندوں کو یہ علم بھی نہیں کہ وہ کس گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، حکومت کا تصور اُن کے لیے اجنبی ہے۔ وہ بانس اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ دن کا آغاز شکار سے کرتے ہیں اور اس کام کے لیے پتھر اور کلہاڑی استعمال کرتے ہیں۔ سؤر کا شکار بڑے شوق سے کرتے ہیں اور وہ اُس کا گوشت کچا ہی کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگ آگ کا استعمال جانتے ہیں اگرچہ اُسے قدیم طریقے پر دو لکڑیاں رگڑ کر حاصل کیا جاتا ہے۔

نیوکیلیڈونیا کے جزیرے پر نیم سفید فرانسیسی آباد ہیں۔ ۱۸۷۰ء میں پیرس کی ناکام اشتراکی بغاوت کے بعد سینکڑوں کمیونسٹوں کو گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ اُن کے مقامی باشندوں کے ساتھ اختلاط سے نیم سفید نسل وجود میں آگئی۔ نیوکیلیڈونیا جو نکل کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے، ابھی تک فرانسیسی عملداری میں ہے۔

مانا کا جادو

جزائر بحرالکاہل میں عیسائی مشنری سرگرمِ عمل ہیں۔ ایک پادری نے جزیرہ رابال کے متعلق دلچسپ باتیں سُنائیں۔ جب وہاں قحط سالی یا کوئی اور مصیبت نازل ہوتی ہے، تو تمام دیہاتی اکٹھے ہو کر ایسا شخص تلاش کرتے ہیں جو اُن کے خیال میں اس ابتلا کا سبب ہوتا ہے۔ اُس بدنصیب شخص کو "موکوا" کا نام دے کر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اُس کے واویلے پر کوئی توجہ نہیں دیتا اور چند دنوں بعد وہ سب کچھ تسلیم کر لیتا ہے۔ پھر فیصلے کے دن رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر سامنے آتا ہے۔ میدان میں "مجرم" کے ساتھ اُس کا پُتلا رکھ دیا جاتا ہے جس کے قریب مرغ کی آنکھیں، مختلف پرندوں کے پر اور چمگادڑ کا خُون بکھیر دیتے ہیں۔ "موکوا" ایک بار پھر اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے ایک ہار گلے میں ڈال لیتا ہے۔ اب بڑا جادوگر جسے مانا کہا جاتا ہے، منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر مُجرم کے پُتلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غریب "موکوا" اس کے فوراً بعد پسینے میں نہانے لگتا ہے اور چند منٹ کے اندر اندر اُس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

میرے مشنری دوست نے وضاحت کی کہ یہ خالصتہً نفسیاتی

معاملہ ہے۔ اگر کسی شخص پر "مانا" کے جادو کا رعب پڑ جائے تو وہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ایسے آدمی بھی دیکھے گئے ہیں جو اس جادو سے ہلاک نہیں ہُوئے۔

موت کی بارات

اگرچہ جنگِ عظیم دوم کے دوران میں ان جزیروں کے باشندے بیرونی دنیا سے واقف ہُوئے، لیکن سفید فام لوگوں کی آمد کے پہلے ہی دن سے اُن پر ابتلا کے دروازے کُھل گئے تھے۔ انگریز مہم جو کیپٹن کُک نے کاوائی کے جزیرے پر قدم رکھا تو چند سال بعد وہاں کے لوگوں میں آتشک جیسا مُوذی مرض پھیل گیا۔ لندن سے غسرے کا ایک مریض فجی پہنچا، تو وہاں وبا پھیلنے سے تیس ہزار افراد ہلاک ہو گئے۔ بیماریوں کے علاوہ سفید فاموں کی بدسلوکی سے بھی ان لوگوں کو بہت تکلیفیں پہنچیں۔ مہذّب ہونے کا دعویٰ کرنے والوں نے صنفِ نازک کے معاملے میں ہوسناکی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ انسانیت نے سر پیٹ لیا۔

ان جزائر کے باشندے ماضی قریب تک جہالت اور توہّم پرستی میں بُری طرح جکڑے ہُوئے تھے۔ ارسکائین نامی جہاز ران، جو ۱۸۴۹ء میں فجی پہنچا تھا، لکھتا ہے:

"مقامی عبادت خانے میں ایک بیس سالہ لاغر و ناتواں نوجوان سے ملاقات ہُوئی جو چٹائی لپیٹ رہا تھا۔ مَیں نے اس سے پُوچھا: 'کہاں جا رہے ہو؟' اُس نے بے بسی سے جواب دیا: 'دفن ہونے۔' پتہ چلا کہ اُس نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ اُس کا کہنا تھا: 'مَیں اتنا دُبلا پتلا ہوں کہ عورتوں کو مُنہ نہیں دکھا سکتا۔' میں نے اُسے زندہ رہنے کی ترغیب دی، لیکن وہ مرنے پر مصر رہا۔

"اسی دوران میں اُس کے والدین، بہن بھائی اور دیگر رشتے دار اُسے لینے آ گئے۔ نوجوان نے بات کیے بغیر چٹائی بغل میں دبائی اور آگے آگے چل کھڑا ہُوا۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ستم ظریف رشتے دار رونے پیٹنے کے بجائے گپّیں ہانکتے جا رہے تھے۔

"آخر کار مرنے والے کی "بارات" ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں پہلے بھی قبریں موجود تھیں۔ نوجوان نے چل پھر کر جگہ کا انتخاب کیا۔ اُس کا والد اور دوسرے رشتے دار قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ بہن نے اُسے نیا جنگلی لباس پہنایا، جسم پر سیندور اور کالا رنگ ملا اور مُردہ رشتے داروں کے نام پیغام دیے۔

"باپ نے قبر تیّار ہونے کا اعلان کیا تو ماں بیٹی نے باری باری گہرا سانس لے کر نوجوان کا جسم سُونگھا۔ اُس نے پانی مانگا، تو باپ نے درشتی سے کہا: 'زندگی بھر ہمارے لیے مصیبت بنے رہے اور اب مرنے کے وقت بھی ستانے سے باز نہیں آتے۔' بہر حال نوجوان کو پانی پلایا گیا اور باپ نے اُسے چار فٹ گہری قبر میں اُترنے کا حُکم دیا۔ وہ قبر میں اُتر گیا، تو اُس کا جسم چٹائی میں لپیٹ کر درختوں کے ریشوں سے باندھ دیا گیا۔ نوجوان کو لٹاتے وقت اُس نے دونوں ہاتھوں میں وہیل کے دانت پکڑ رکھّے تھے۔ اب اُس کے باپ اور رشتے داروں نے "سانیکو" (خُدا حافظ) کہہ کر قبر میں مٹّی ڈالنا شروع کی۔ نوجوان نے بھی جواب میں کئی بار "سانیکو" کہا اور پھر اُس کی آواز دبتی چلی گئی۔ قبر پُوری طرح مٹّی سے بھر گئی، تو لڑکے کے ماں باپ ایک دوسرے سے پیٹھ ملا کر اُس پر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے کسی قسم کے تأثّر سے عاری تھے۔ اُنھوں نے قبر پر چند شاخیں اور پتّے ڈالے اور پھر ساتھ والی ندی میں نہانے چلے گئے۔"

خیال ہے کہ زندہ درگور کرنے کی یہ رسم ختم ہو چکی ہو گی لیکن یہ لوگ تہذیبی تقاضوں سے ابھی کوسوں دُور ہیں۔ وہ ڈھول بجا بجا کر ساری رات ناچتے اور لہو و لعب میں مصروف رہتے ہیں۔ جہالت کی بنا پر وہ شارک مچھلی کو سمندری دیوی تصوّر کرتے ہیں۔

مَیں جنگِ عظیم دوم کے دوران میں سولومن کے جزیرے مالیٹا میں تھا جو آدم خور وحشیوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہم کبھی کبھار مقامی لوگوں کی بستیوں میں چلے جاتے۔ مَیں ایک سیاہ فام لڑکے کے ہمراہ اُس کی جھونپڑی میں گیا۔ لڑکا انگریزی زبان سمجھتا تھا۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں اُس کا بُوڑھا باپ دو چھوٹے پتّھروں کی مدد سے تربوز جتنا بڑا پتّھر تراش رہا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ درخت کاٹنے کے لیے کلہاڑی تیّار کر رہا ہے۔

یہ لڑکا بعد میں فوجیوں کے ہمراہ امریکہ آ گیا۔ اُس نے یہاں ایک میڈیکل اسکول میں ڈاکٹری کی تعلیم مکمّل کی اور پھر ہارلم میں پریکٹس شروع کر دی۔ کئی برس بعد اُس کا خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ اُس کے باپ نے پتّھر کی بنی کلہاڑی کرسمس کے موقع پر اُسے بطور تحفہ بھیج دی۔

رقص کا جزیرہ

مثل مشہور ہے: "چینی تجارت کے لیے، جاپانی ملک گیری کے لیے اور ملائی قسمت آزمائی کے لیے سفر کرتے ہیں، لیکن وہ (ملائی) انجام کار چینیوں کی دولت اور جاپانیوں کی تلوار چھین لیتے ہیں۔"

خُوب صُورت اور نازک اندام ملائی بحرالکاہل کے بہت سے ممالک مثلاً انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن، نیوگنی، جاپان اور جنوبی کوریا میں آباد ہیں۔ وہ بحرالکاہل کے سب سے زیادہ چاق چوبند، خُوبرو اور خوش گفتار باشندے ہیں۔

انڈونیشیا کے بیشتر ملائی مسلمان ہیں، جبکہ فلپائن میں اُن کی اکثریت عیسائی ہے۔ مسلمان مسجدوں میں نماز کے لیے ضرور جاتے ہیں، لیکن وہ ابھی تک ضعیف الاعتقاد ہیں۔ گھر لوٹتے ہُوئے کسی نہ کسی جوتشی سے اپنی قسمت کا حال دریافت کریں گے۔ اس کے علاوہ ملائی معاشرت پر ہندو ثقافت کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ یہاں جوگی، فقیر اور گرو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہندو ترکِ دُنیا کو اچھا سمجھتا ہے، لیکن اب اُس میں بھی مادّہ پرستی اور روحانیت کی کشمکش شروع ہو چکی ہے۔ جزیرہ بالی کے ہندو رقص کو لیجیے، اُس کا پس منظر اگرچہ مذہبی ہے، لیکن دیکھنے اور ناچنے والوں کے جذبات بُری طرح بے قابو ہوتے ہیں۔

فلپائن میں لوگوں کی کلائیوں پر خُوبصورت گھڑیاں بندھی نظر آئیں گی، لیکن یہ صرف زیب و زینت اور دکھاوے کے لیے ہیں۔ یہ لوگ وقت کی قدر کرنا نہیں جانتے اور یہ ناقدری صرف ملائی باشندوں تک محدود نہیں، بلکہ بحرالکاہل کے اکثر باسی اس بُرائی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے، تو ان کا قصور بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ سُورج، چاند اور ستاروں سے رہنمائی حاصل کرتے آئے ہیں اور یُوں اُن کا خاص مزاج بن گیا ہے۔

ایک انڈونیشی سے ملاقات ہُوئی جسے سیاسیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ اُس کی گفتگو انتہائی مدلّل اور دلچسپ تھی۔ وہ اشتراکیت پر بحث کرتے ہوئے افلاطُون، ڈارون، سٹڈنی ٹک، ہیگل اور مارکس کے حوالے دے رہا تھا۔

"افلاطون کب فوت ہُوا تھا؟" مَیں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہُوئے پوچھا۔

"یہی کوئی ڈارون کے زمانے میں۔" اُس نے بغیر سوچے جواب دیا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بولا: "سچ پوچھیے، تو مجھے معلوم نہیں کہ ڈارون کب مرا تھا۔"

لاشوں کی دعوت
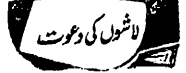
پولینیشیا، بحرِ جنوبی، پیرا ڈائسز اور جزائرِ سنی پر مشتمل ہے۔ مَیں چودہ برس کی عُمر میں اس نام سے واقف ہُوا جب لاس اینجلز میں مجھے بحرِ منجمد جنوبی پر ایک نمائش دیکھنے کا موقع ملا۔

پولینیشیا کا مطلب ہے "بہت سے جزیرے"۔ بحرالکاہل میں ان جزیروں کی تکون ہوائی سے ایسٹر آئی لینڈ اور پھر وہاں سے نیوزی لینڈ تک پھیلی ہُوئی ہے۔ اس مثلّث کا ایک ضلع ساڑھے چار ہزار میل اور دوسرا چار ہزار آٹھ سو میل طویل ہے۔ مارکوئیس، آسٹرالز اور کُکس سمیت جنوب مغربی پولینیشیا کے تمام جزیرے اکٹھے کر دیے جائیں تو وہ اکیلے جزیرہ ہوائی کے مقابلے میں چھوٹے ثابت ہوں گے۔ دراصل پولینیشیا دنیا کا بہت بڑا سمندری خلا ہے۔ مارکوئیس کے جزیرے نوکوہیوا کے قریب زیرِ آب ایک ایک ہزار فٹ بلند خطرناک چٹانیں پائی جاتی ہیں۔ ایک چٹان سے دوسری چٹان تک سفر کے لیے کشتی میں جانا پڑتا ہے۔

اس خطّے کی عورت پستہ قد، مگر مضبوط جسم کی مالک ہوتی ہے۔ چھوٹے جبڑے اور بھدے لمبے پاؤں ایک طرح اُس کی پہچان ہیں۔ مرد اور عورت کی چال ڈھال قریب قریب یکساں ہوتی ہے۔ اُنھیں دُور سے شناخت نہیں کیا جا سکتا۔

پولینیشی اپنے جانوروں کے بارے میں خاصے بے رحم ثابت ہُوئے ہیں۔ وہ گھوڑا دوڑاتے رہتے ہیں جب تک وہ بے ہوش ہو کر گر نہ پڑے یا مر نہ جائے۔ اگر بدقسمتی سے کُتّے کا پاؤں مچھلی پکڑنے کے کانٹے میں پھنس جائے، تو وہ اُسے چیختا چلّاتا دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ مَیں نے آج تک کسی پولینیشی کو کُتّے کے آگے لقمہ ڈالتے نہیں دیکھا۔ اس سنگدلی کے باوجود وہ اپنے بچّوں سے از حد پیار کرتے ہیں۔ انھیں سُرخ رنگ بہت پسند ہے۔

بنگٹ ڈینیل سن کئی برس پولینیشیا میں رہا۔ اُس کا کہنا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے قوانینِ قدرت کی کم ہی پابندی کرتے ہیں کسی زمانے میں قبیلے کے سردار کنوارے پن کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اگر کسی لڑکی کی عفت پر شک گزرتا، تو اُس کا باپ سینکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں اُسے ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیتا تھا یہ ہوا کے قبائلی سردار لوگوں کو دعوت پر بُلاتے اور دھوکے سے اپنا "چوبی محل" اُن پر گرا کر لطف اندوز ہوتے۔ قیدیوں کو سمندر کے کنارے پر وحشیانہ سزا دی جاتی۔ اُن کے جسموں پر گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور پھر انہیں کُھلا چھوڑ دیتے۔ اکثر "مجرم" پانی تک رسائی سے پہلے ہی شعلوں میں جل کر بھسم ہو جاتے۔ مُردوں کی تِکّا بوٹی کر کے دعوت اُڑائی جاتی۔

ویسے اب مہذب دنیا کے ساتھ روابط کی وجہ سے پُرانے طور طریقے بدل رہے ہیں۔ پھر بھی بحرالکاہل کی عظیم وسعتوں اور بے پایاں فاصلوں کو سمیٹنے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔

نرالا خِطّہ

مائیکرونیشیا کا مطلب ہے "چھوٹے جزیرے"۔ ان جزائر کا سلسلہ خطِ استوا کے نیچے سے شمال مغربی سمت میں اُوپر کو اُٹھتا ہے اور جزائر گلبرٹ، مارشل، کیرولین اور میریانا سے ہوتا ہُوا جزائر پیلاؤ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے جو فلپائن کے قریب واقع ہیں۔

نقشے میں مائیکرونیشیا ایک بہت بڑی سمندری پٹّی کی صُورت میں نظر آتا ہے اس میں چھوٹے چھوٹے جزیرے نقطوں کی طرح پھیلے ہُوئے ہیں اور ہر سو میل کے علاقے میں کوئی نہ کوئی خشکی کا ٹکڑا ضرور موجود ہے۔

مائیکرونیشیا میں امریکہ کے مقبوضہ جزائر کا رقبہ ۹۰۰ مربّع میل ہے۔ گوام امریکہ کا بہت بڑا بحری اڈّا ہے، لیکن بین البرِّاعظمی میزائلوں کی ایجاد سے اس کی اہمیت بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ جزیرہ اولیتھی کے ساحل پر ۱۸۵ مربّع میل پر محیط کھاڑی ہے جسے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں امریکہ نے بحری اڈّے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اس علاقے میں آباد جاپانی تھوڑے بہت چاول بو لیتے ہیں۔ اکثر لوگ مچھلی، جھینگے اور کھوپرا کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ آٹھ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔

مجمع الجزائر مارشل چونتیس چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ اس کا کُل رقبہ صرف انہتّر مربّع میل ہے اور ایک تہائی جزیرے بے آباد پڑے ہیں۔

مائیکرونیشیا کی آبادی کے بڑے حصّے کو عیسائی بنا لیا گیا ہے، لیکن تاریک خیالی ابھی تک اُن کے ذہن سے محو نہیں ہُوئی۔ وہ سمندر، چاند، سُورج اور ستاروں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں سکاؤ نامی جھاڑی کی جڑوں سے طاقت ور شراب تیّار کی جاتی ہے۔ جس کے دو تین گھونٹ پینے ہی سے آدمی ہوش حواس کھو بیٹھتا ہے۔

بیچارے ایبوریجن

مٹی کے رنگ دھڑنگ پُتلے اور آسٹریلیا کے قدیم باشندے (ایبوریجن) میں کوئی فرق نہیں۔ وہ نینڈرتھل مین اور جاوا مین سے بھی پُرانی تہذیب کا وارث ہے۔ بلاشبہ وہ ایک چلتا پھرتا انسان ہے، لیکن کسی دوسرے سیارے سے آئی ہُوئی مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے وہ ابھی تک پتّھر کے دور میں زندگی گزار رہا ہے۔ آپ اُسے آسٹریلیا کے لق و دق صحرا میں زانو پر پاؤں دھرے ایک ٹانگ پر کھڑا دیکھیں گے۔ ایک دُبلا پتلا کتّا بھی اُس کے ہمراہ ہو گا۔ دونوں آپ کو دیکھتے ہی کسی ٹیلے یا جھاڑی کے پیچھے چُھپ جائیں گے۔

ماہرینِ علم الانسان کا کہنا ہے کہ یہ دُنیا کے سادہ ترین انسان ہیں اور اُس وقت آسٹریلیا میں وارد ہُوئے تھے جب یہ علاقہ زمینی پٹّی کے ذریعے ایشیا سے ملا ہُوا تھا۔ وہ ہزاروں برس بے مقصد گھومتے پھرے۔ انہوں نے مستقل بُود و باش کہیں اختیار نہ کی اور اس بادیہ پیمائی کے نتیجے میں اُن کی تہذیب حجری دور سے آگے نہ بڑھ سکی اور بستیاں بسانے کا شعور بھی پیدا نہ ہو سکا۔

آسٹریلیا کے یہ قدیم باشندے اب بھی بے آب و گیاہ صحرا میں زندگی گزار رہے ہیں؛ البتہ سفید فام لوگوں کی آمد کے بعد وہ خاص علاقے میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں جو طبعی اعتبار سے ملک کا بدترین خِطّہ ہے۔

مَیں ایک بار جیپ میں اُن کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ مجھے دُور ایک ٹیلے پر چھ ایبوریجن کھڑے دکھائی دیے۔ مَیں جیپ ٹھہرا کر دُوربین سے اُنہیں دیکھنے لگا۔ اُن میں سے ایک آدمی نے افق

کی طرف اشارہ کیا جہاں بادل کا ایک ٹکڑا فضا میں تیر رہا تھا۔ اچانک اُن لوگوں نے بادل کی سمت بھاگنا شروع کیا۔ مَیں بھی جیپ میں پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ ٹیلوں کو پھلانگتے برابر دوڑ رہے تھے۔ مجھے اُن کی اس حالت پر رحم آ رہا تھا۔ یہ ساری تگ و دو پانی کے لیے تھی۔ وہ لگاتار تین گھنٹے تک بھاگتے رہے۔ بادل برسنے لگا، تو اُن لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اُچھلنے کُودنے لگے۔ بارش آٹھ دس منٹ بعد رُک گئی۔ خشک زمین نے تمام پانی جذب کر لیا تھا۔ ایبوریجن ٹیلوں کے اِرد گرد گھومنے لگے۔ ایک جگہ پانی کا چھوٹا سا گڑھا نظر آیا۔ اُنہوں نے دوزانو ہو کر بگلے کی طرح گردنیں جھکائیں اور پانی کا ایک ایک قطرہ پی گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بے چارے کس تنگی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔

ایبوریجن خشک اور بنجر علاقے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ آسٹریلیا کا یہ علاقہ لاکھوں مربّع میل پر مشتمل ہے۔ تیز گرم ہوا کے طوفانوں نے زمین کو ادھیڑ کر گڑھے ڈال دیے ہیں۔ خشک وادیوں میں تیس چالیس فٹ گہری طویل خندقیں ملتی ہیں۔ یہاں "سالٹ بُش" کی اِکّا دکّا جھاڑیوں کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ کئی سفید فام علاقے کا سروے کرنے کے لیے نکلے، مگر بعد میں اُن کی لاشیں ہی مل سکیں۔ یہ ایبوریجن ہی ہیں جو ہزاروں برس سے یہاں رہ رہے ہیں اور ناسازگار ماحول میں بھی زندگی بسر کرنا جانتے ہیں۔

مینڈک کا پانی

مَیں قدیم آسٹریلوی باشندوں کی طرزِ بُود و باش سے آگاہ ہونے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ ایک دوست نے اس سلسلے میں مدد کرنے کا وعدہ کیا اور ایک دن ہم لینڈ روور پر سوار ہُوئے اور ایک قدیم بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس گھر کے سامنے ہماری گاڑی رُکی، وہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ لباس کے بندھن سے بالکل آزاد تھے۔ ہم نے قریب پہنچ کر اُن کے گھریلو سامان کا اندازہ کیا۔ وہ آگ پیدا کرنے والی دو لکڑیوں، پتّھر کی چُھریوں، چوبی نیزے اور ایک بوم رینگ پر مشتمل تھا۔ بوم رینگ ان لوگوں کا خاص ہتھیار ہے جس کی خاص خوبی یہ ہے کہ شکار کو ہلاک یا زخمی

ری ۶۸۲

پاسِ ادب

ڈاکٹر اقبالؒ اپنے اُستاد شمس العلما، مولوی سید میر حسن کا بہت احترام کرتے تھے یہاں تک کہ ادب کو ملحوظ رکھتے ہُوئے کبھی اپنا کلام تک سُنانے کی جُرأت نہیں کی۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا، وہ بھی اتفاقی طور پر۔ واقعہ یُوں ہے کہ مَیں اپنے اُستاد کے ہاں جا رہا تھا، مگر اُستاد صاحب راستے میں ہی مل گئے۔ اُن کے ساتھ ایک بچّہ تھا جو اُن کے عزیزوں میں سے کسی کا تھا۔

مولوی صاحب نے کہا: "اقبال، اسے گود میں اٹھا لو!" بچّے کا نام احسان تھا۔ کچھ دُور جا کر مَیں تھک گیا اور بچّے کو دُکان کے ایک تھڑے پر کھڑا کر دیا اور کچھ دیر سستانے لگا۔

مولوی صاحب کہنے لگے: "اس کی برداشت بھی دُشواری ہے۔" اور میری زبان سے بے اختیار نکل گیا ؏

تیرا احسان بہت بھاری ہے

(مُرسلہ: فریدہ بانو)

کرنے کے بعد شکاری کی طرف پلٹ آتا ہے۔

تنکوں سے بنی ایک ٹوکری خشک کیڑے مکوڑوں اور چھوٹے موٹے مُردہ جانوروں سے ایک طرف بھری رکھی تھی۔ دو لڑکے جن کی عمریں دس بارہ برس کے لگ بھگ تھیں، چیونٹیاں مار مار کر اکٹھی کر رہے تھے۔

ہم لوگ گھرانے کے سربراہ سے ملے جس کا نام ایڈجی تھا۔ میرے دوست نے سگریٹ پیش کیا اور اُس نے توڑ مروڑ کر اس کا تمبا کو مُنہ میں رکھ لیا۔ اُس شخص کے جسم سے عجیب طرح کی بدبُو اُٹھ رہی تھی۔ سارے جسم پر میل کچیل کی تہہ جمی ہُوئی تھی اور بال بُری طرح اُلجھے ہُوئے تھے۔

لڑکے اپنے کام سے فارغ ہُوئے ہی تھے کہ سامنے کی جھاڑی میں ایک بڑی چھپکلی نظر آئی اور اُنھوں نے اُسے پتّھر مار کر زخمی کر دیا، لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آئی۔ یہ دیکھ کر ایڈجی نے بوم رینگ اٹھایا، اُس پر چربی ملی اور جھاڑی سے کچھ فاصلے پر آ کر بوم رینگ کا وار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھپکلی دو ٹکڑے ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

آسٹریلیا کے ایبوریجن اپنے اپنے علاقے میں سات آٹھ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہ زبانیں مشکل بھی بہت ہیں۔ میرا دوست بیس سال کے عرصے میں بمشکل ایک زبان سیکھ سکا۔ اس کے برعکس ایک دس بارہ سال کا ایبوریجن ان تمام زبانوں پر عبور رکھتا ہے۔

آسٹریلیا کا قدیم باشندہ رُوسو کے "سپلینڈڈ سیویج" (پرشکوہ وحشی) کی ہُوبہو تصویر ہے۔ وہ زراعت، مویشی پالنے، دھات کے اوزاروں سے کام لینے اور اعداد کے علم سے بالکل ناواقف ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے لق و دق صحراؤں میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔ البتہ پانی اُس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بارش برسنے کے بعد انہیں پانی سے بھرا گڑھا مل جائے تو بہت خوب، ورنہ گیلی ریت ہی چُوس کر گزارہ کر لیتے ہیں۔

میرے دوست نے بتایا کہ ایبوریجن ایک خاص جھاڑی کی جڑیں چباتے رہتے ہیں جس سے پیاس بُجھ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخصوص طرح کا صحرائی مینڈک "نچوڑ" کر بھی وہ اپنی تشنگی دُور کر لیتے ہیں۔ اس مینڈک کے پیٹ میں ایک تھیلی ہوتی ہے جسے وہ گرم خُشک موسم میں پانی سے بھرے رکھتا ہے۔

ایبوریجن کے نزدیک، خدا، دیوی دیوتا یا کسی اور معبود کا کوئی تصوّر نہیں۔ وہ درخت، پہاڑ اور بادل کو نئے پیدا ہونے والے بچّے کا خالق سمجھتے ہیں۔ ہر بچّے کے دو نام ہوتے ہیں اور دوسرا نام فطرت کی کسی نہ کسی قہرمانی طاقت کی نسبت سے رکھا جاتا ہے، لیکن وہ کسی بچّے کو اس نام سے نہیں پکارتے۔

جوانی کی حدود میں داخل ہوتے ہی لڑکا سخت امتحان سے گزرتا ہے۔ دہکتے انگاروں پر سبز پتّے ڈال کر اُسے اُن پر آدھ منٹ کے لیے بٹھایا جاتا ہے۔ اس دوران میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اُس کے اُوپر آگ پھینکتے اور گیت گاتے رہتے ہیں۔ ●●